NOS\NOTE2.tif not found.

10

سرسید احمد خاں

مصنف کا تعارف

سرسید احمد خاں 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان تشریف لائے اور شاہی دربار سے وابستہ ہوکر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں سرسید کے دادا کو ''جوادالدولہ'' کا خطاب دیا گیا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کے والد میر تقی کو عہدۂ وزارت کی پیشکش کی مگر اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انہوں نے انکار کردیا۔ سرسید کی والدہ نہایت مذہبی، خوش سلیقہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اولاد کی تربیت میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ سرسید کی تربیت خالص مشرقی اور مذہبی ماحول میں ہوئی۔ قرآن شریف پڑھنے کے بعد انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور 22 سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو اکیاسی برس کی عمر میں رحلت فرمائی اور مسلم یونیورسٹی کی مسجد کے بیرونی حصے میں دفن ہوئے۔

سرسید بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف، ممتاز مفکر، عظیم المرتبت مصلح اور مدبر تھے۔ انہوں نے ملک وقوم کی بیداری کا مشکل فریضہ انجام دیا۔ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ تاریخ، دینیات اور اخلاقیات ان کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مشہور زمانے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں علمی اور فلسفیانہ مضامین لکھے۔ اردو ادب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ انہوں نے اردو میں علمی نثر کو فروغ دیا۔ تصنع اور مشکل پسندی کو تحریر وتقریر سے دور رکھا اور اپنی ہر بات سادگی اور صفائی کے ساتھ کہتے رہے۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لیے جو پیغام پہنچانا ہے وہ سادہ اور آسان زبان میں بیان کردیا جائے۔ اسی وجہ سے انہیں جدید اردو نثر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ قوم کی بھلائی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ اے۔ ایم۔ یو کالج علی گڑھ کا قیام ہے جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- سبق میں پڑھے ہوئے مشکل الفاظ کے معنی سمجھ کر اپنی گفتگو میں استعمال کر سکیں گے؛
- سبق میں پڑھی ہوئی تلمیحات کو سمجھ کر ان کی تشریح کر سکیں گے؛
- امید کی اہمیت کو سمجھ کر زندگی میں اس کی افادیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔

10.1 اصل سبق

آیئے اب ایک بار پورا سبق پڑھ لیں۔

''امید کی خوشی''

(1)

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو، اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے! تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

رسائی: پہنچ

او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے، تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل سے مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی کے لیے تیار ہے انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

خوابیدہ: سوتے ہوئے

NOS\NOTE2.tif not found.

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس نامید کو ناامید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسنے دل کو مرنے نہیں دیا تو ہی نے اس کو ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اسی اعلیٰ درجے پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔ اس نیک نبی کو جس نے برس ہا برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوب صورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ تو ہی طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

(2)

اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامیدوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے، تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے، تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانے کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے۔ اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے، سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے، کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے، سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخر کار ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی، تیری آواز ہمارے لیے خوش آیند راگنیاں ہوں گی۔ سورہ میرے بچے سورہ، اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جائیں گے تو تم کیا کرو گے؟ تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کر سکیں گے۔

اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو گے، آہ ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یاد میں آنسو بہاؤ گے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کے تم رنجیدہ ہوگے۔ سورہ میرے بچے سورہ، میرے بالے سورہ۔ یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں۔ جبکہ بچہ

پہلا گنہگار انسان: تلمیح مراد! حضرت آدم علیہ السلام، جنہیں شیطان نے بہکا کر خدا کی حکم عدولی پر تیار کیا اور جنت سے نکلوا دیا۔

نیک نبی: (مراد) حضرت ابراہیم علیہ السلام

پہلا ناخدا: (مراد) حضرت نوح علیہ السلام

ناخدا: کشتی کھینچنے والا ملاّح

جودی پہاڑ: پہاڑ کا نام جہاں حضرت نوح کی کشتی رکی تھی

خوش الحان: دلکش اور اچھی آواز والا

خصلت: عادت

لیاقت: قابلیت

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO not found.

غوں غاں بھی نہیں کرسکتا تھا۔مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا اور اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا، رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا، اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل سے، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اس کے ماں باپ اس معصوم پسر سے سچی ہمدردی دیکھ کر کیسے خوش ہوتے ہیں، او ہماری پیاری امید تو ہی ہے۔ جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

آتش محبت: ماں کی آگ
ریا: دکھاوا
پسر: بیٹا
مہد: پالنا
لحد: قبر

(3)

دیکھ وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کی ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے، وہ اس کو ڈھونڈتا ہے۔ پر وہ نہیں ملتا، مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی، لہو بھرا دانتوں پھٹا کرتا دیکھتا ہے، پھر بھی ملنے سے ناامید نہیں۔ فاقوں سے خشک، غم سے زار نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں، کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا: تلمیح (مراد) حضرت یعقوب

دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے۔اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار باغی قوم و مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے، بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے، عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

بے گناہ قیدی: تلمیح (مراد) حضرت یوسف

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقارے سے تیری ہی آواز سنتا ہے۔ وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔

تقویت: طاقت، ہمت
بگل: قرنا: ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے
قومی بھلائی کا پیاسا: مراد! سرسید

NOS\NOTE2.tif not found.

جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے، شہری وحشی بتاتے ہیں، دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو جاتے ہے۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دِوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر ہاں ہاں کر کے محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں پر کوٹھی کٹھلے سے الگ ہو کر دل ہر وقت بے قرار ہے، کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا، مگر اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے، تیری قوت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے، تیرے ہی سبب گو ہر مراد کو پاویں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری ''امید''، تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہو جاتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہو جاتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یاد ہی مددگار رہتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو صبح کی خوشی سے بدل دیتی ہے، گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوف ناک چیز ہے اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانے کی لہر بھی نہیں پہنچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے، ایمان کے توشہ اور امید کے ماوی اور موت کی سواری سے مگران سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام ''امید'' ہے۔

(سرسید احمد خان)

توشہ: وہ کھانا جو مسافر ساتھ لے جائے

10.2 متن کی تشریح (پہلا حصہ)

سبق ''امید کی خوشی''، مضمون نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ مضمون میں کسی ایک موضوع کی اہمیت و افادیت پر ٹھوس دلائل کے ساتھ علمی طریقے سے زور دیا جاتا ہے۔ سرسید سے قبل اردو زبان عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے بہت مشکل اور

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

بوجھل ہوگئی تھی۔ سرسید نے اس مشکل رویہ کو ترک کر کے اپنی بات کو سیدھی، صاف اور سادہ زبان میں پیش کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی رغبت دلائی۔مضمون نگاری کو اردو کے غیر افسانوی ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔

سبق کے پہلے حصے میں مصنف نے دھنک، ستاروں اور پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیوں وغیرہ کی مثال دے کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو چیزیں ہماری پہنچ سے دور ہوتی ہیں وہ ہمیں اپنے قریب کی چیزوں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ ہماری زندگی میں بھی جو چیزیں بہت دور ہے، وہی ہمیں سب سے زیادہ خوشی دینے والی ہے۔ پھر وہ سوال کرتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے؟ پھر پہیلی بوجھنے کے سے انداز میں ہمیں سے سوال کرتا ہے کہ کیا وہ عقل ہے؟ کیوں کہ عقل ہی کی بنیاد پر انسان کو دنیا کی تمام مخلوق سے افضل مانا گیا ہے۔ پھر خود اس سے انکار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ چیز عقل نہیں ہے کیونکہ عقل تو صرف قدرت کے جلوؤں ہی کو دکھا سکتی ہے۔ اس تمہید کے بعد مصنف اصل مطلب کی طرف آتا ہے اور صاف صاف لفظوں میں ہمیں بتاتا ہے کہ وہ چیز جو ہم سے دور تو ہے مگر ہماری زندگی کے مشکل سے مشکل حالات میں ہمیں سہارا دیتی ہے۔ اس کا نام ''امید'' ہے۔ امید ہی کی بنیاد پر ہم اپنی پوری زندگی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اور امید ہی سے قوت اور طاقت لے کر ان منصوبوں کو پورا کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

آپ نے پڑھا ''تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لیے۔ نام آوری نام آوری کے لیے۔ بہادری بہادری کے لیے۔ فیاضی، فیاضی کے لیے۔ محبت، محبت کے لیے۔ نیکی، نیکی کے لیے تیار ہے۔'' کیا آپ نے غور کیا کہ مصنف نے تکرار لفظی سے اپنی بات میں کتنا زور پیدا کر دیا ہے۔ یہاں ایک ہی لفظ کو دوبار استعمال کر کے امید کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر امید نہ ہو تو خوشی، خوشی نہ رہے۔ نام آوری بے معنی ہو جائے۔ بہادری کوئی مہم سر نہ کر سکے، فیاضی میں کوئی کشش باقی نہ رہ جائے۔ امید ہی محبت کو پروان چڑھاتی ہے اور نیکی پر اکساتی ہے۔ اگلے پیراگراف میں آپ نے پڑھا ''وہ پہلا گنہگار انسان شیطان کے چنگل میں پھنسا'' تلمیح ہے۔ یہاں پہلا گنہگار انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ یہاں مصنف نے حضرت آدم کا ذکر کر کے پھر امید کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جب حضرت آدم کو سزا کے طور پر سنسان اور بیاباں دنیا میں اکیلے بھیج دیا گیا تو یہ امید ہی تھی جس کا دامن تھام کر حضرت آدم نے خدا کے حضور میں گریہ وزاری کی اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ یہاں تک کہ خدا نے انہیں معاف کر کے پھر اسی اونچے مقام پر پہنچا دیا یعنی اپنا نبی بنایا۔

اسی پیراگراف میں آپ نے پڑھا ''وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا'' یہاں پھر تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں پہلا ناخدا سے حضرت نوح مراد ہیں۔ حضرت نوح کے زمانے میں اتنا بڑا سیلاب آیا تھا جس میں پوری دنیا غرق ہوگئی تھی۔ مگر ایسے مشکل وقت میں حضرت نوح صرف اس امید پر اپنی کشتی کھیتے چلے جاتے تھے کہ کبھی نہ کبھی ساحل پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ اگر ان کے دل میں پکا یقین نہ ہوتا تو ساری دنیا کے ساتھ حضرت نوح بھی اسی سیلاب کی نذر ہو جاتے۔

NOS\NOTE2.tif not found.

آپ نے پڑھا۔ ''زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔'' یہاں مصنف نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے جب حضرت نوح اور ان کے ساتھی بھوکے پیاسے سیلاب میں بہے جا رہے تھے، کہ اچانک اندھیرے میں امید کی کرن کی طرح چند کبوتر چونچ میں زیتون کی ٹہنیاں دبائے انہیں نظر آئے اور لوگ خوش ہو گئے۔ کہ اب ہم جلد ہی خشکی پر پہنچ جائیں گے۔

10.3 زبان کے بارے میں

ناخدا کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ حضرت نوح چونکہ سیلاب میں تنہا کشتی کھیتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اس لیے انہیں ناخدا کہا گیا ہے۔

''نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید'' کہہ کر مصنف نے امید کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

متن پر سوالات 10.1

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. سب سے زیادہ خوش کرنے والی چیز سے مصنف کی مراد ہے۔
   - (i) عقل
   - (ii) امید
   - (iii) دور سے خوب صورت نظر آنے والی چیزیں۔
2. ''تیرے ہی سبب ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔'' اس جملے میں کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟
   - (i) امید کی روشنی ہماری پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔
   - (ii) ہمارے حیوانی جذبات ابھر آتے ہیں۔
   - (iii) خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔
3. تلمیح ایسی عبارت کو کہتے ہیں جس میں۔
   - (i) کسی مشہور واقع یا مشہور شخصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔
   - (ii) کوئی استعارہ استعمال کیا گیا ہو۔
   - (iii) امید کی فضیلت بیان کی گئی ہو۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

10.4 متن کی تشریح (دوسرا حصہ)

امید کو آسمانوں کی روشنی اور ناامیدوں کی تسلی بتاتے ہوئے مصنف یہ کہتا ہے کہ امید کے سہارے ہی ہر ایک کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے، امید ہی ہر درد کی دوا ہے اور امید ہی ہر غم کو دور کرتی ہے۔

عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکنے والوں سے مصنف کی مراد علمی کام کرنے والوں اور سائنس دانوں سے ہے جو اپنی کوششوں میں جب کہیں لڑکھڑاتے ہیں تو امید ہی انہیں سہارا دیتی ہے اور ناکامی کے چٹیل میدان میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر ان کے تھکے ہارے خیالات میں ایک نئی زندگی اور نئی امنگ پیدا کر دیتی ہے اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔

اگلے پیراگراف میں مصنف نے ایک لوری کے سہارے نادان بچے سے وابستہ ماں باپ کی تمام امیدوں کا ذکر کیا ہے۔اس میں مصنف نے ماں باپ کی موجودہ اور مرنے کے بعد کی زندگی اور بچے کی زندگی کے تینوں ادوار کو امید کے رسے سے باندھا ہے۔اسی پیراگراف کے آخر میں مصنف نے ''اور ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔'' اس سے مصنف کی مراد یہ کہ انسان تمام عمر امید ہی کے بل بوتے پر زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے کڑی محنت کرتا ہے۔

10.5 زبان کے بارے میں

''مہد سے لحد تک'' کے معنی ہیں ''پالنے سے قبر تک'' یعنی پیدائش سے لے کر موت تک جو چیز ہمیں ہر لمحے زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کی امنگ عطا کرتی ہے وہ امید ہے۔

متن پر سوالات 10.2

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے۔

1. وہ کون سی طاقت ہے جو انسان سے مشکل ترین کام انجام دلواتی ہے۔
   (i) عقل مندی
   (ii) دور اندیشی
   (iii) امید

2. ماں باپ اپنی تمام تر خواہشات نادان بچے سے وابستہ کر لیتے ہیں کیونکہ......
   (i) وہ ان کی تمام تر امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔
   (ii) وہ بھولا بھالا ہوتا ہے۔

(iii) وہ ان کے بس میں ہوتا ہے۔

3. ''مہد سے لحد تک'' سے مراد ہے۔

(i) بڑھاپے کی آخری منزل تک۔

(ii) قبر کے عذاب تک۔

(iii) پالنے سے قبر تک۔

10.6 متن کی تشریح (تیسرا حصہ)

سبق کے اس حصے میں مصنف نے پھر کچھ تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ آپ نے پڑھا۔ ''دیکھ وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں غائب ہو گیا ہے۔''

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ''وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا'' سے مصنف کی مراد حضرت یعقوب سے ہے۔ حضرت یوسف کے گم ہو جانے کے غم میں روتے روتے ان کی آنکھوں کی پتلیاں بہہ گئیں تھیں جسے مصنف نے ''آنکھیں سفید ہو گئی'' کہا ہے۔ غم واندوہ کی اس انتہائی کیفیت کے باوجود حضرت یعقوب کے دل کے کسی کونے میں یہ امید پھر بھی باقی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی میرا بیٹا مجھ سے مل ہی جائے۔

اگلے پیراگراف میں آپ نے پڑھا۔ ''دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے۔'' یہ بھی تلمیح ہے۔ ''بے گناہ قیدی'' سے حضرت یوسف مراد ہیں۔ جنہیں ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنویں میں دھکیل دیا تھا جنگل کے اس اندھیرے کنویں میں انہیں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ مگر یہ امید ہی تھی جس نے انہیں ڈر کے مارے مرنے سے بچا لیا کہ شاید کبھی کوئی قافلہ ادھر آنکلے اور مجھے کنویں سے باہر نکال لے۔

اسی پیراگراف میں ''بہادروں کی قوت بازو'' اور ''بہادری کی ماں'' امید کو کہا گیا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ سپاہیوں میں ایسی بہادری کیسے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ کے میدان میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ سب امید کی قوت ہی ہے جو ان کے اندر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے سبق میں اپنا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو پستی سے نکالنے کے لیے جی جان سے محنت کی مگر ان کی قوم ایسی ناسمجھ اور نادان تھی کہ بھلائی کے کاموں میں ان کی مدد کرنے کے بجائے انہیں کبھی دیوانہ کہتی تھی کبھی کافر ٹھہراتی تھی۔ سر سید کے عزیز و اقارب انہیں سمجھاتے تھے کہ تم کن جاہلوں کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر وہ اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں اتنا برا بھلا کہا جاتا تھا کہ کبھی کبھی وہ خود بھی ہمت ہار بیٹھتے تھے مگر ایسے نازک وقت میں امید ہی انہیں سہارا

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

دیتی تھی اور ان کی ہمت بندھاتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میری یہ نا سمجھ قوم میرے نیک جذبات کو ضرور سمجھ لے گی اور میرے مشوروں پر عمل کرے گی۔

سبق کے آخری حصے میں مصنف نے انسانی زندگی کے آخری دور کے سب سے مشکل وقت یعنی موت کو بھی امید کے سہارے آسان کر دکھایا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جب انسان کے اوپر جاں کنی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس کا سب سے مشکل وقت ہوتا ہے۔ مگر اس وقت بھی انسان اس یقین اور بھروسے سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے کہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے وہ مجھے بھی بخش دے گا۔ اور یہی امید اور یقین اس کے اس کڑے وقت کو آسان کر دیتی ہے۔
سر سید نے اس سبق کے شروع میں امید کو ''نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی'' اور سبق کے آخر میں امید کو ایمان کی خوب صورت بیٹی'' کہہ کر امید کی فضیلت بیان کی ہے۔

10.7 زبان کے بارے میں

''قومی بھلائی کا پیاسا'' سے مراد خود سر سید ہیں۔
1857ء کے غدر کے بعد سر سید نے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اور اصلاحی کوششیں شروع کیں جو سر سید تحریک کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی اور سائنس کی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی حکومت کے سہارے اپنی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں۔ جب کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو دین کے خلاف سمجھتا تھا۔ سر سید نے جس قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا وہی قوم ان کی اصلاحی کوششوں میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی۔ انہیں دیوانہ اور کافر تک گردانا گیا۔ مگر وہ قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہے اور اس کے لیے علی گڑھ میں محمڈن انگلو اورینٹل کالج کھولا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سر سید کی اس تحریک نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔
''تیری راہ'' سے مصنف کی مراد مرنے کے بعد کی زندگی یعنی دوسری دنیا سے ہے۔
''ایمان کا توشہ'' سے مصنف کی مراد یہاں پختہ ایمان ہے۔
''امید کا ماوی'' سے امید کی روشنی ہے۔
''موت کی سواری'' سے جان کنی کی حالت مراد ہے۔
''ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے'' سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ انسان چار چیزوں یعنی آب، باد، خاک اور آتش یعنی ہوا، پانی، مٹی اور آگ سے مل کر بنا ہے۔ مرنے کے بعد یہ چاروں چیزیں انہیں چیزوں میں مل جاتی ہیں۔ اس بات کو چکبست نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

NOS\NOTE2.tif not found.

موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا۔

متن پر سوالات 10.3

درست جواب پر صحیح کا نشان لگائیے:

1. ''دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا گھر میں بیٹھا روتا ہے۔'' میں بڈھے سے مراد ہے۔
   (i) حضرت یوسف
   (ii) حضرت نوح
   (iii) حضرت یعقوب

2. ''وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں۔ بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں۔'' میں سرسید کو دیوانہ کہنے سے مصنف کی مراد ہے۔
   (i) سرسید قوم کے غم میں پاگل ہو گئے تھے۔
   (ii) سرسید رشتہ داروں کے سمجھانے کے باوجود دیوانوں کی طرح قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔
   (iii) سرسید بہت ضدی تھے اور کسی کی بات نہیں مانتے تھے۔

3. ''ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، ہوا ہوا میں، مٹی مٹی میں، پانی پانی میں ملنے کو ہوتی ہے۔'' اس جملے سے مصنف کی مراد ہے۔
   (i) آب، باد، خاک، نور۔
   (ii) آگ، خاک، باد، برف۔
   (iii) آب، باد، خاک، آتش۔

10.8 اسلوب بیان

سرسید سے قبل اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے اردو زبان بہت مشکل اور پیچیدہ ہوگئی تھی۔ سرسید کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو میں ایک نئی طرح کی علمی نثر کا رواج شروع ہوا۔ جو تصنع اور مشکل پسندی سے پاک تھا۔ سرسید اپنی سادگی۔ صفائی اور بے تکلفی سے کہتے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ قوم کی بھلائی کے لیے جو پیغام پہنچانا ہے وہ سادہ اور آسان زبان میں بیان کر دیا جائے۔ اور لمبی لمبی تحریروں کے بجائے مفید صفحات میں کام کی بات کہہ دی جائے۔

سرسید کا ذہن ایک عمل پسند کا ذہن تھا جسے ادبی حسن سے زیادہ ٹھوس حقائق، زور بیان اور سادہ طرز اظہار عزیز تھا۔ اس لیے ان کی نثر ایک الگ اسلوب اور وزن رکھتی ہے۔ ان کا یہ اسلوب بڑھتے ہوئے سائنسی میدان اور عقلی رجحان سے ہم آہنگ ہو گیا اور کسی نہ کسی شکل میں آج بھی اردو نثر کا اسلوب ہے۔

\NOIS_F-04-02\nOTE\NO
not found.

آپ نے کیا سیکھا؟

مضمون نگاری، غیر افسانوی ادب کی ایک صنف ہے۔ مضمون نگاری میں کسی ایک موضوع پر معروضی طریقے سے بحث کی جاتی ہے۔ جس میں معلومات اور سنجیدہ دلائل پر سارا زور ہوتا ہے۔ مضمون عام طور پر علمی انداز لیے ہوئے ہوتا ہے۔

- اس سبق میں سر سید نے مختلف مثالوں کے ذریعے امید کی اہمیت وافادیت بیان کی ہے۔
- سبق میں بہت سی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔
- انسان امید کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک امید کے سہارے ہی مشکل حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔
- امید انسان کے جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اور اسے زندگی میں مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔
- ترقی کی ساری منزلیں امید کے سہارے ہی طے ہوتی رہی ہیں۔
- امید ہی نے سائنس دانوں کو نئی نئی ایجادات کے لیے اکسایا ہے۔ جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ بخشا ہے۔
- نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوب صورت بیٹی کہہ کر مصنف نے امید کی فضیلت بیان کی ہے۔
- سر سید کا یہ مضمون ان کی صاف، سادہ اور سنجیدہ تحریر کا نمونہ ہے۔

10.9 اختتامی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھیے۔

1. اس سبق میں مصنف نے کس چیز کی اہمیت وافادیت پر زور دیا ہے۔ مختصر لکھئے۔
2. سبق میں کون کون سی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھئے۔
3. مصنف نے یقین کی اکلوتی بیٹی اور ایمان کی خوب صورت بیٹی کسے کہا ہے؟ وہ انسان کو کہاں کہاں سہارا دیتی ہے؟
4. ’’ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے۔‘‘ اس جملے کی تشریح کیجئے۔
5. سر سید کے اسلوب بیان پر روشنی ڈالئے۔